رجسٹرڈ نمبر اے ۹۲۲
ٹیلی فون نمبر ۲۹

تار کا پتہ
"انجمن" علی گڑھ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۴	۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء	ایڈیٹر:- قاضی عبدالغفار	۲۹ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ	نمبر ۲۴

یہ نہ کیجیے

ایک مضبوط تنظیم کے بغیر عوامی تحریکیں کاغذ کی ناؤ بن جاتی ہیں جو چند روز پانی میں تیر کر ڈوب جایا کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے ہر اس شخص کو واقف ہونا چاہئے جو خلوص کے ساتھ کوئی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ مرکزیت کے بغیر کوئی تنظیم اور ڈسپلن قائم نہیں رہ سکتی اور تنظیم اور ڈسپلن کے بغیر کوئی تحریک سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اگر اس مسلمہ اصول سے بھی کسی کو انکار ہو تو ہم اسے اپنا مخاطب نہیں بناتے۔

اردو کی تحریک کا مرکز اور اردو کی مخالفت کا قلعہ اس وقت اتر پردیش ہے۔ اس لئے قدرتاً نظریں اتر پردیش کی تحریک کے حالات کی طرف زیادہ جاتی ہیں اور یہاں کے کارکنوں کی ذرا سی لغزش بھی آنکھوں میں کھٹک جاتی ہے۔

حال ہی میں بعض اضلاع کے ایسے واقعات نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ پیشتر اس سے کہ یہ رجحان بڑھے ہم اردو کے دوستوں اور حامیوں کو ٹوک دیں۔ اتر پردیش میں صوبائی شاخ قائم کر کے انجمن نے اپنی جد و جہد کو زیادہ منظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ریاستی مسائل کی حد تک صوبائی شاخ کی مرکزیت کمزور نہ ہونے پائے۔ جس طرح مرکزی انجمن اس بات کو پسند نہ کرے گی کہ اصولی اور پالیسی کے مسائل میں صوبائی شاخ اس کے مشورے سے بے نیاز ہو کر یا اس کی پالیسی سے ہٹ کر کوئی کام کرے اسی طرح صوبائی کمیٹی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اضلاع کی شاخیں اس کی مرکزیت سے بے پروا ہوں۔

چند روز ہوئے ایک ضلع کی شاخ نے اپنے ایک وفد کے ذریعہ سے ایک منسٹر کے سامنے ایک یادداشت پیش کر دی۔ مگر ایسا کرنے کی کوئی اجازت صوبائی کمیٹی سے حاصل نہیں کی گئی تھی۔ پھر ایک دوسری شاخ کے چند کارکن چیف منسٹر سے ملاقات کرنے پہنچ گئے اور بہت مایوس ہو کر واپس آئے۔ اس ملاقات میں بنارس کے دوستوں نے ایسے مسئلے اٹھا دیے جن کو صرف صوبائی کمیٹی ہی (مرکزی انجمن سے مشورہ کر کے) اٹھا سکتی ہے۔ اس عمل سے قدرے پیچیدگی پیدا ہو گئی۔

بعض شاخوں کے عہدے داروں نے اخباروں میں بیانات شائع کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ایسا کرنے کے وہ مجاز نہیں ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنے مرکز یعنی صوبائی شاخ کو کسی مسئلے پر توجہ دلائیں۔

سب سے زیادہ افسوسناک اور خطرناک یہ رجحان ہے کہ اردو زبان کے نام سے بعض شاخوں کے کارکن اپنے لئے سرکار پرستی کے پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ وزیروں اور بڑے بڑے نیتاؤں سے اتصال پیدا کرنے کے لئے اردو کی تحریک ایک آلہ کار بنائی جانے لگی ہے یعنی ان دوستوں کے خیال میں اردو بھی ایک تقریب بہر ملاقات ہے!!

اس صورت حال نے اب ایک یہ رخ اختیار کیا ہے کہ سرکاری لوگ اور وہ لوگ جو سو فیصدی حکومت کے آدمی ہیں، شاخوں کے اعلیٰ عہدوں پر چنے جانے لگے ہیں۔ شاخوں کو تو اس سے کوئی فائدہ پہنچے

یا نہ پہنچے لیکن کارکنوں کی ذاتی اغراض کے لئے ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور اردو کی تحریک مراتب اور مدارج کی ترقی کے لئے ایک سیڑھی بن جاتی ہے یہ خطرات ہیں اور ہمارے راستے کی خندقیں ہیں جن سے ہمیں بچ کر چلنا چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے کہ کسی دن ہماری تنظیم کا شیرازہ بکھرنے لگے۔ سوبائی شاخوں کو سختی کے ساتھ ان رجحانات کو دبانا چاہئے اور شعوری نظم و ضبط پر زور دینا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ایسا کریں گی اور اردو کی تحریک کے مخلص کارکن بھی اس کا لحاظ رکھیں کہ کہیں وہ یا ان کے شرکائے کار ان ادنیٰ ترغیبات کا شکار نہ ہو جائیں۔ ابھی انجمن اپنے سفر کا بہت دشوار گزار راستہ طے کرنا ہے۔ معلوم نہیں کہ صدر جمہوریہ کا جواب کیا ہوگا لیکن جو کچھ بھی ہو اردو کا یہ قافلہ تو اب آگے ہی بڑھے گا۔ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

عجیب تضاد

ابھی انجمن ترقی اردو کا معروضہ صدر جمہوریہ کے سامنے زیر غور ہے اور صدر مملکت نے ان اختیارات کے تحت جو انہیں دستور کے تحت حاصل ہیں یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اردو زبان کس علاقے کی علاقائی زبان ہے۔ لیکن حد بندی کمیشن نے یہ رائے قائم کر لی کہ اس زبان کا تصرف وجود صرف حیدرآباد کے ایک تحصیل برابر رقبہ میں ہے یا بہار کے چند اضلاع میں جو لاکھوں اردو بولنے والی آبادی سے کاٹ کر بنگال کو دے جا رہے ہیں۔ اتر پردیش کے معاملے کو تو کمیشن نے صاف اڑا دیا ہے۔ اس کی رپورٹ کے الفاظ کے جنگل میں ڈھونڈتے پھرئے لیکن شمالی ہندوستان میں اردو کے وجود کا پتہ نہیں چلتا!

طرفہ یہ کہ دستور کی دفعہ ۳۴۷ میں صدر جمہوریہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ یہ دیکھیں کہ کسی خاص علاقے میں کسی خاص زبان کے بولنے والوں کی ایک (SUBSTANTIAL) قابل لحاظ تعداد موجود ہے تو وہ اس زبان کو ایسے علاقے کی علاقائی زبان تسلیم کر سکتے ہیں (SUBSTANTIAL) کا لفظ کچھ وضاحت چاہتا ہے۔ (SUBSTANTIAL) کسی علاقے میں ۱۰ فیصدی بھی ہو سکتے ہیں اور پچاس فی صد بھی۔ اس کا فیصلہ صدر کے فیصلے پر منحصر اور وہی اس (SUBSTANTIAL) کی توضیح کرنے کے مجاز ہیں۔ لیکن حد بندی کمیشن نے بلا تکلف یہ سفارش کر دی کہ جہاں ۷۰ فیصد سے کم کسی زبان کے بولنے والے ہوں وہاں وہ زبان علاقائی نہ مانی جا سکے گی۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ دستور کے منشا کے مطابق یہ معاملہ صدر جمہوریہ کے اختیار تمیزی پر منحصر رکھا جاتا لیکن کمیشن کو اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دوسرے مسائل پر بھی سفارشیں پیش کرنے کی جلدی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کمیشن کی بعض سفارشیں بہت دانشمندانہ اور منصفانہ ہیں۔ لیکن ابھی اس رائے کو بدلنے کے لئے ہمیں کوئی بہانہ نہیں ملتا کہ اردو کے معاملے میں کمیشن نے بہت غلط زاویۂ نظر اختیار کیا ہے اور ہمیں تو اس کی رپورٹ کے کسی گوشے میں اردو کے متعلق کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ یہ سچ ہے کہ اقلیتوں کی زبانوں کی حفاظت اور ترقی کے متعلق کمیشن نے دستور کے اصولوں کی پابندی کی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں اردو کا شمار کسی بہت ہی نیچے درجے میں کیا گیا ہے! صدر جمہوریہ کے فیصلے سے پہلے کمیشن کے فیصلے نے سمپورنانند جی کو صاف لفظوں میں یہ کہنے کے قابل بنا دیا کہ اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ مردم شماری کی مصنوعی رپورٹ ایک طرف اور حد بندی کمیشن کا نقطۂ نظر دوسری طرف ——— بیچ میں اردو کے مخالفین اپنے قلعے کو اور بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم کر سکتے ہیں!!

ہمیں ان پیچ در پیچ رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

نواب ہوشیار جنگ مرحوم

مرحوم حیدرآباد میں اردو کے ایک بہت اچھے ادیب اور صاحب ذوق اہل قلم تھے۔ حیدرآباد کے علمی حلقوں میں ان کا وجود بہت نمایاں تھا۔ اور اکثر ان کے مکان پر شعرا اور ادیبوں کے بہت پر لطف اجتماعات ہوا کرتے تھے۔ حیدرآباد اور ہندوستان کے بہت سے ادیب اور شاعر ایسے تھے جو اکثر نواب صاحب مرحوم کی سرپرستی سے مستفید ہوا کرتے تھے اور بہت عرصے تک ان کی علم دوستی کو یاد کریں گے۔ مرحوم خود بھی ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن مشاعروں کے شاعر نہ تھے اور کبھی کسی نے ان کا کلام کسی بڑے مشاعرے میں نہیں سنا۔ لیکن جب کبھی وہ اپنا کلام سنانے پر رضامند ہو جاتے تھے تو دوستوں کی صحبتوں کو باغ و بہار بنا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو سکون ابدی عطا فرمائے۔

جوابی امور کیلئے کارڈ یا دو آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
(منیجر)

ہلکے ہلکے اشارے

——— انجمن کی شاخ بلند شہر نے اترپردیش کے چیف منسٹر کی خدمت میں جب وہ بلند شہر تشریف لے گئے تھے ایک سپاس نامہ اردو کے مسئلہ کے متعلق پیش کر ڈالا۔ سپاس نامہ کے مندرجات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اضلاع کی شاخوں کے لئے صوبائی کمیٹی کی اجازت اور مشورے کے بغیر اس قسم کے سپاس نامے پیش کرنا مناسب بھی ہے یا نہیں، اہم بنیادی مسائل پر حکومت کے اعلیٰ حکام سے گفت و شنید کرنا مرکزی انجمن یا صوبائی انجمن ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر ضلع کی شاخ یا اس کے عہدہ داروں کو اس ذمے داری کا وزن برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہونا چاہئے

——— الّا یہ کہ چیف منسٹر یا منسٹروں سے ملاقات کی یہ ایک تقریب بنائی جائے!! ——— اس طرف صوبائی کمیٹی کو توجہ کرنی چاہئے۔

——— قطع نظر اس اصولی بحث کے دلچسپ اخباری اطلاع یہ ہے کہ

آنریبل ڈاکٹر شری سمپورنانند وزیر اعظم اترپردیش ہندی ساہتیہ سمیلن شاخ بلند شہر کی عمارت کا افتتاح کرنے کی غرض سے ۲۰ر اکتوبر کو بلند شہر آنے والے تھے۔ معلوم ہونے پر کارکنان انجمن ترقی اردو شاخ بلند شہر نے بھی چاہا کہ ایک سپاس نامہ پیش کرنے کا شرف حاصل کر سکیں۔ کانگریس دفتر میں پہونچ کر سپاس نامہ کو پروگرام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن نہ کیا گیا۔ مجبور ہو کر ہندی ساہتیہ سمیلن کے کارکنان سے درخواست کی گئی کہ ہمارے سپاس نامے کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اس لئے کہ اس موقعے پر میونسپل بورڈ وغیرہ کے سپاسنامے بھی پیش ہونے تھے۔ سمیلن کے سکریٹری شری رام پرشاد تیواری سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے بے تکلف فرمایا کہ ہم اردو سے متعلق سپاسنامہ کو پیش کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ ہمارا تو مقصد ہی اردو کو ختم کرنا ہے۔ اور ہماری یہ سب کوششیں اردو کا نام و نشان مٹانے کے لئے ہیں۔ عرض کیا گیا کہ کیا شری سمپورنانند جی جو اس کا افتتاح کر رہے ہیں وہ بھی آپ کے اس خیال سے متفق ہیں۔

——— جدید ہندی کے متعلق ارشاد ہوا کہ سادہ اور سہل زبان ہر موقع پر کام نہیں دے سکتی۔ ہم کو نئے الفاظ لینے پڑیں گے اور سوائے سنسکرت کے کسی دوسری زبان سے نہیں لئے جا سکتے۔

آخر میں فرمایا کہ:-

اردو ہندی دو زبانیں نہیں ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اردو زبان نام کی کوئی زبان ہی موجود نہیں ہے پھر اس کے لئے علاقہ کا سوال اٹھانا فضول ہے...... عرض کیا گیا کہ دستور ہند میں بھی کو علاقائی زبانوں کا ذکر ہے جس میں اردو زبان بھی شامل ہے۔

فرمانے لگے ہم تو یہی ایجی ٹیشن کرنے والے ہیں کہ اردو کو علاقائی زبانوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔

——— چیف منسٹر صاحب نے اگر اپنی تقریر میں دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا نام نہیں لیا تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ——— سمیلن کے سکریٹری صاحب نے تو صاف ہی کہہ دیا کہ وہ دستور کی فہرست میں سے ہی اردو کا نام نکلوا دینا چاہتے ہیں۔

——— اترپردیش میں اس کانٹے کی نوک کسی طرح گوارا نہیں!!

——— میسور، ۵ر اکتوبر، لیجسلیٹو کونسل میں ہندی کو فروغ دینے کے لئے ایک بہترین نسخہ پیش کیا گیا۔ مشورہ دیا گیا کہ ہندی کی ترقی کے لئے جنوبی و شمالی ہندوستانیوں کے درمیان شادی بیاہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کانگریسی رکن مسٹر پاپی سیتارامیہ نے بتایا کہ اس مشورے کے تسلیم کرنے کی صورت میں جنوبی ہندوستان میں ہندی مستقل بن جائے گی۔

——— اردو اور ہندی کے متعلق اگر شمالی ہندوستان میں بھی یہی نسخہ استعمال کیا جائے تو کتنے مسائل حل ہو جاتے ہیں!

ایک طرف تو اترپردیش کے گورنر مسٹر منشی لکھنؤ میں طلبا کی اردو کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہیں اور دوسری طرف اسی ریاست کے چیف منسٹر شری سمپورنانند بنارس کے ایک وفد سے صاف صاف فرماتے ہیں کہ اردو اس ریاست میں علاقائی زبان نہیں بنائی جا سکتی۔

——— یہ نہ پوچھئے کہ کیوں اور کس لئے ——— مختصر یہ کہ سمپورنانند جی نے حساب لگایا تو اس ریاست میں دس بارہ فی صدی سے زیادہ اردو بولنے والے معلوم نہ ہوئے ——— اور یہ اتنے بھی ابھی چند روز سے نمودار ہوئے ہیں یعنی جب سے ۲۰½ لاکھ دستخط صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس نام کی کوئی زبان ہی اترپردیش میں نہ تھی!!

——— معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حدت اور شدت میں تدریجاً کچھ کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور عمومی مسائل میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ——— چند ہی سال پہلے برطانیہ کے وزیر اعظم ہندوستان کی طلب آزادی کے جواب میں فرما رہے تھے کہ میں اس لئے اس سلطنت کا صدر نہیں بنایا گیا ہوں

کہ اس کو تحلیل کر دوں ـــــ اور آج ہندوستان میں وہ سلطنت تحلیل ہو گئی! دراصل یہ معاملہ شروع ہوتا ہے انکار اور نفی سے، پھر اس انکار اور نفی کی شدت کم ہوتی جاتی ہے اور طلب حقوق کا جذبہ کمزور نہ ہو جائے تو جتنا وہ طاقتور ہوتا ہے۔ نفی اور انکار پیچھے ہٹتا ہے ـــــ وہ لوگ ہی ایسی باتوں سے گھبراتے ہیں اور مایوس ہونے لگتے ہیں جو نہیں جانتے کہ قومی مسائل کا مدوجزر کس طرح کام کرتا ہے!!

ـــــ کتابوں کے ناشروں کی انجمن کو خطاب کرتے ہوئے اور یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اب حکومت خود بھی بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کا کام شروع کرنے والی ہے جسب معمول بہت دلچسپ باتیں فرمائیں۔

انھوں نے فرمایا کہ ہندی زبان کو زیادہ آسان اور عام فہم بنایا جائے۔ انھوں نے کہا ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان تو بنایا گیا ہے لیکن خود دارالسلطنت میں ـــــ صحیح اعداد تو معلوم نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے اخباروں کی اشاعت ہندی کے اخباروں سے بہت زیادہ ہے

وہ ہم ہندی کے متعلق شور تو بہت مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اردو زبان کو علاقائی زبانوں میں شامل نہ کریں گے، لیکن اترپردیش، پنجاب اور دہلی میں اردو زبان بہت وسیع پیمانے پر رائج ہے اور بجا طور پر ایسا ہے۔ پنجاب میں ہندی اور پنجابی کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے، لیکن ساری بحث کو فریقین اردو زبان ہی میں جاری رکھتے ہیں۔"

ـــــ اس زمانہ کے عجائبات میں سے یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ ایک طرف کل ہند کے وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ اترپردیش پنجاب اور دہلی میں اردو وسیع پیمانے پر رائج ہے اور اس کو علاقائی زبانوں میں شمار ہونا چاہئے ـــــ مگر اترپردیش کے بڑے وزیر صاف اعلان کرتے ہیں کہ اردو تو اترپردیش کی علاقائی زبان نہیں ہو سکتی

ـــــ "ایک بام دو ہوا" اسی کو کہتے ہیں! ایک ہی نقطہ پر دو طرف سے ہوا چل رہی ہے!!

ـــــ مشاعروں کا زمانہ آگیا ہے اور مشاعرہ بازوں اور شاعروں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے اور یہ کاروبار ہر سال صرف اردو کی خدمت ترقی اور اس کے درد سے بے تاب ہو کر کیا جاتا ہے۔ گرمی کے بدلتے ہی نہ تو اردو کی ترقی اور اس کے درد کے علاج کا خیال کسی شاعر صاحب کو آتا ہے نہ مشاعرہ بازی پلٹ کر دیکھتے ہیں کہ اردو بے چاری پر کیا گزر رہی ہے جبھی تو کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ بازوں کو اردو کا درد نہیں پیٹ کا درد ہوتا ہے۔

ریاست دہلی

معاصر ریاست دہلی نے اپنے ۱۲ دسمبر کے اداریہ میں "مسئلہ اردو" کے عنوان سے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی اس تقریر پر اظہار خیال کیا ہے جو انھوں نے حیدرآباد دکن میں اردو ہال کا افتتاح کرتے ہوئے فرمائی ہے ـــــ ساتھ ہی یوپی کے گورنر مسٹر منشی کے اس بیان پر بھی رائے زنی کی ہے جو انھوں نے یوپی اسٹوڈنٹس اردو کنونشن لکھنؤ کے اجلاس میں دیا ہے۔

" مرکزی گورنمنٹ کے وزیر اعظم اور یوپی کے گورنر کے ان بیانات کا صاف مطلب یہ ہے کہ اردو کو ختم نہ ہونا چاہئے اور اس زبان کو شمالی ہند میں یا دوسرے کسی صوبے میں جہاں یہ بولی جاتی ہے۔ زندہ رہنا چاہئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ان بیانات کو طفل تسلیاں قرار نہ دیا جانا چاہئے۔ جب کہ عملی طور پر یہ زبان شمالی ہند کے تمام صوبہ جات میں سے ہی ختم کی جا رہی ہے۔ سرکاری کاغذات میں سے اردو کو اڑا دیا گیا۔ عدالتوں میں اردو میں لکھی گئی درخواستیں واپس کر دی جاتی ہیں۔ سائن بورڈوں میں سے اردو کو مٹا دیا گیا اور جہاں تک یوپی میں اردو کا سوال ہے۔ یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کے ممبران اسمبلی اور وزراء میں سے نوے فیصدی بزرگ کھدر کے لباس میں پکے اور کٹر مہا سبھائی اور جن سنگھی ہیں جو اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہوئے اس کو قطعی ختم کر دینا چاہتے ہیں اور ختم کر رہے ہیں۔

اگر پنڈت نہرو کا بیان اپنے اندر ذمہ داری کا کچھ بھی احساس رکھتا ہے تو گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے شمالی ہند کے صوبہ جات کو مجبور کرے اور ان صوبہ جات میں اردو کو ایک علاقائی زبان قرار دیا جائے ورنہ اس زبان کو ایک علاقائی زبان نہ قرار دیا جانا اور اردو کے حق میں صرف تقریریں کرنا بیانات اردو کے لئے طفل تسلیاں ہیں جن کی نہ کوئی قدر ہے نہ قیمت ہونا چاہئے ہیں کہ پنڈت نہرو اردو زبان کو شمالی ہندوستان کے صوبہ جات میں زندہ رکھنے کے لئے موثر قدم اٹھائیں"

معاصر ریاست کے اس بے لاگ تبصرے کے بعد اب کسی مزید تبصرے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ورنہ کہنے کی باتیں تو بہت سی ہیں اور برابر کہی بھی جا رہی ہیں۔

معاصر ریاست نے پچھلے چند ہفتوں کے اندر کئی بار اپنے اداریے میں اردو زبان کے جائز حق کی بابت لکھا ہے اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان کو زندہ رکھا جائے گا۔

خطبۂ صدارت

قاضی محمد عبدالغفار

جو مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین علی گڑھ کے کل ہند سالانہ مشاعرہ
۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء میں پڑھا گیا۔

بھائیو!

پہلے اس سے کہ آج کے مشاعرے کی کارروائی شروع ہو ہمیں اپنی محفل ادب کے کئی درخشاں ستاروں کا ماتم کرنا ہے خواجہ حسن نظامی، استاد بیخود دہلوی، علامہ کیفی، اقبال سہیل۔ اور ایسے ہی کئی ادب اور فن کے پروردگار ہماری دنیا سے اٹھ گئے اس کے ساتھ ہی ہمارے شعرا کی نئی نسل میں بھی جواں مرگی کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ میرا جی اور منٹو کے بعد اب حال ہی میں ہمارے ملک کے ممتاز شاعر اور محبوب ادیب اسرار الحق مجاز کی باری آگئی اور وہ ۵ دسمبر کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ مگر اپنے بعد اپنی شاعری کے جواہر ریزوں کے علاوہ اپنی زندگی کے ان شدید کوائف و آلام کی یاد بھی ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ جنھوں نے عمر طبعی سے بہت پہلے ہمارے متعدد نوجوان ادیبوں کی زندگی کو ختم کر دیا ہے اور کرتے رہیں گے۔ اگر وہ معاشی حالات نہ بدلے جو ہمارے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی زندگی کو ایک عذاب بنا دیتے ہیں۔ مجاز ایک شاعر اور ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے مخصوص کردار کی وجہ سے بھی ایک دل چسپ شخصیت رکھتے تھے۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی جبکہ ان کی عمر کا بڑا حصہ انتہائی افلاس اور تنگ دستی کا مقابلہ کرتے گزرا انھوں نے اپنی شان استغنا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ گزشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ حکومت ہند ان کے لئے کوئی امدادی وظیفہ مقرر کر دے۔ اور اس کوشش میں کامیابی کی پوری امید تھی۔ لیکن درخواست کا فارم دوستوں کے پاس پڑا رہا اور اس بندۂ خدا نے اتنی پروا بھی نہ کی کہ اس پر دستخط کر دیتا۔ وہ ہمیشہ دولت اور ثروت کی نمود و نمائش سے بے پروا رہے اور اپنی اسی وضعداری کو سنبھالے ہوئے دنیا سے گزر گئے۔ سطحی نظر سے مرحوم کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ شراب نوشی کی کثرت نے ان کی زندگی کو ختم کر دیا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ وہ کیوں اتنے بڑے شرابی بن گئے۔ وہ حالات کیا تھے جن کے درد و کرب نے انھیں میخانہ کی طرف ڈھکیلا اور وہ حالات نہ ہوتے تو مجاز کیا ہوتے۔ ایسے کم نظر نقادوں اور نکتہ چینوں سے میں تو شاعری زبان میں اتنا ہی کہوں گا کہ

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

مجھے یقین ہے کہ آج آپ سب میرے ساتھ ان کے لئے سوگوار ہیں۔

کسی نے کہا تھا کہ

شاعری جزویست از پیغمبری

یہ بات غلط بھی ہے اور صحیح بھی ہے۔ اس کا صحیح ہونا اور غلط ہونا منحصر ہے اس پر کہ ہم شاعری سے کیا کام لیتے ہیں۔ قدرت نے ہمیں انگور جیسا خوش ذائقہ پھل دیا مگر ہم نے اس کی شراب بنائی۔ قدرت نے ہماری زمین میں لوہا اور فولاد پیدا کیا مگر ہم نے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے اس کی تلواریں بنائیں۔ جدید سائنس نے بڑی بڑی نعمتیں ہم کو دیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ایٹم بم بھی ہم کو مل گیا!

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اچھی چیز برے طریقے سے استعمال کی جائے تو وہ بری ہو جاتی ہے اور بری چیز اگر اچھی نیت سے استعمال کی جائے تو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ یہی حال آرٹ، ادب اور مختلف فنون کا ہے۔ جس طرح اس دور کے عظیم الشان انقلاب نے ہماری زندگی کی قدروں کو بدلا ہے۔ اسی طرح شاعری میں بھی ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا ہے جو اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے سوچنے اور دیکھنے کے زاویے بالکل بدل گئے۔ اس لئے ہمیں اپنی ادبی بحثوں اور مشاعروں کا انداز بھی بدلنا پڑ رہا ہے۔ اسے بدقسمتی کہئے یا خوش قسمتی ہمارا ملک ابھی تک بہت قدامت پرست ہے ہم اس منزل پر ہیں جہاں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی ٹکر ہو رہی ہے۔ اور ابھی تک ان دونوں میں سے کسی کو یقینی فتح حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس عبوری دور میں نئی نئی قدریں اور زندگی کی جدید قوتیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم میں سے اکثر اچھے اور برے کی تمیز نہ کر کے بہک جاتے ہیں اور اس کی ہزار ہا مثالیں شعر اور

ادب کے حلقوں میں آج ہمارے سامنے ہیں ایسا اکثر ہوا ہے اور اب بھی ممکن ہے کہ مخالف حالات شاعری کو ملک کی تہذیب بڑھانے کا آلہ بنانے کے بجائے اس کو ہماری تہذیبی اور اخلاقی پستی کا سبب بنا دیں ہماری شاعری کی ماضی قریب میں یہ حقیقت بالکل عریاں ہے کہ سوسائٹی اور ماحول کی پستی کے ساتھ ساتھ ہماری شاعری کا معیار بھی گرتا چلا گیا۔ ادنیٰ قسم کا ہزل اور تمسخر اور ہجو گوئی سودا۔ انشا۔ مصحفی اور آخر میں لکھنؤ کے جان صاحب تک اسی حقیقت پر دلیل ہے کہ جس طرح سماج گرتی گئی اسی کے ساتھ قومی ادب اور شاعری بھی گرتی چلی گئی۔ بہرحال آرٹ کو زندگی کی عکاسی کرنا ہے اور اس کے آئینے میں زندگی کے ہر شعبے کی تصویریں کم و بیش صحیح نظر آتی ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے میں ہماری سماج کے رہنما اصحاب ثروت جاگیردار امرا۔ اور خود مختار حکمران ہوا کرتے تھے اور انھیں کی حالت کے مطابق ہمارے شعراء کا انداز فکر بھی بدلتا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے ساتھ اپنے فن کو بھی بھانڈوں اور بازار کی عصمت فروشوں کی برابر پہنچا دیتے تھے۔ بادشاہوں اور امرا کی بخششیں ہمارے شعراء اور ادیبوں کے لئے اکثر سم قاتل ثابت ہوتی تھیں۔ اس نئے زمانے میں قدیم دربار اور دیوان خانے تو باقی نہیں رہے لیکن عوام کی معاشی اور اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو گئی اور ساتھ ہی زمانہ اب دوسری قسم کے آشعات میں مبتلا ہو گیا جو زیادہ تر جدید سیاست نے پیدا کیں۔ چنانچہ اب زندگی کے حقائق نے مصلحات اور سلوگن کے سہارے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بتانا شروع کر دیا۔ یہ جادو ایسا چلا کہ ہماری زبان کے الفاظ۔ محاورات اور ترکیبیں بھی بدل گئیں۔ انھیں اصطلاحات میں ایک اصطلاح عوامی لٹریچر کی پیدا ہوئی اور ایک "اسلامی ادب" کے نام سے آج کل زیر بحث ہے جس کا سر اور پاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عوامی ادب بلاشبہ کوئی بے بنیاد اصطلاح نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں یہ وہی بات ہے کہ اچھی چیز کو برے طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس حالت پر حالی کا وہ شعر صادق آتا ہے کہ

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

میں آپ سے اس وقت بہت سی باتیں تو نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ عوامی ادب کے نام سے جو فتنہ پیدا ہو رہا ہے اسے روکئے۔ ورنہ اس افراط و تفریط میں حقیقی عوامی ادب پامال ہو کر رہ جائے گا۔ اس وقت حالت ایسی ہے کہ ہمارے نوجوان کی صفوں میں جس کو دیکھئے عوامی شاعر ہے۔ یعنی وہ اپنی شاعری میں ملک اور عوام کی زندگی کے مسائل کو پیش کر رہا ہے۔ درانحالیکہ آج تک اس نے اپنے شہر کے بازاروں اور محلوں اور کافی ہاؤسوں سے باہر نکل کر اپنے ملک کا ایک چپہ بھی نہیں دیکھا۔ لیکن اپنے شعروں اور مضمونوں میں ملک کے کسانوں اور مزدوروں کے متعلق چند سنی سنائی باتیں لکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ وہ عوامی شاعر یا ادیب بن گیا۔ موجودہ سماج کے متعلق وہ زہر میں بجھے ہوئے تیر چلاتا ہے لیکن اس سماج کی بنیادی خرابیوں سے یکسر ناواقف ہے

حالی نے اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں شعر گوئی کے مختلف پہلوؤں پر جو کچھ کہا ہے وہ آج زندگی کی قدریں بدل جانے کے بعد بڑی حد تک غلط ہو گیا ہے۔ حالی کے فرمودات ان کے زمانے کا کتنا ہی صحیح عکس پیش کرتے ہوں لیکن آج تو زندگی کے موجودہ نقشے میں ہم حالی یا شبلی کو عہد حاضر کی اجتماعی زندگی سے ناآشنا پاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں شعر و ادب کے بہت بڑے محسن اور اپنے زمانے کی حد تک ترقی پسند ادیب تھے لیکن جس شاعری کی اس وقت ضرورت ہے وہ تو اقبال بھی نہ تھے۔ حالانکہ انھوں نے بلاشبہ اپنے زور کلام سے بہت سے مردوں کو جلایا اور بہت سے سونے والوں کو جگایا۔ پھر بھی زمانے کے تغیرات کی رفتار ان کی رفتار سے بہت زیادہ تیز تھی اور وہ دریا کے بہاؤ پر زیادہ دور تک نہ چل سکے۔ البتہ جو بیش بہا میراث انھوں نے نئی نسلوں کے لئے چھوڑی وہ ضرور ایسی ہے کہ ہماری زبان یعنی اردو زبان کی بنیادی روایتوں میں شامل کی جائے۔ لیکن ہمارے نوجوان شعرا میں کتنے ہیں جنھوں نے حالی اور اقبال کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے بھائی اقبال کی تراکیب طرز ادا اور شوکت الفاظ کا چربہ اتارنے کی بہت کوشش کرتے ہیں لیکن جب ان کو موجودہ عوامی مسائل کے قریب لاتے ہیں تو نہیں جانتے کہ کس طرح اقبال یا حالی کی قدروں کو اس بدلتی ہوئی دنیا کے حالات سے ہم آہنگ کریں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بھائیوں کے ادب میں وہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس کے متعلق شاعر نے کہا تھا کہ۔

"موج معنی ہوئی گم بندھ گئے الفاظ کے پل"

آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں کہ شعرا اور ادیبوں کی نئی نسل میں حقیقی عوامی ادب کی بہت کمی ہے اور اس وقت دس پانچ سے زیادہ ایسے ادیب اور شعرا نہیں ہیں جنھیں ہم صحیح طور پر عوامی کہہ سکیں ہمارے مشاعروں کا جو تصور کار فرما ہے اسی کو دیکھ لیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم حقائق کی سرحدوں سے ابھی تک بہت دور ہیں مگر سمجھتے ہیں بہت قریب ہیں۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ادب

سے ہم اپنے ادب کا مقابلہ کریں تو بہ حیثیت مجموعی ہم بہت پیچھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کے کسی ملک میں شعرا کی تعداد اتنی نہیں جتنی ہندستان اور پاکستان میں اردو کے شعرا ہیں۔ پھر اگر ہمارے ادبی رسالوں پر نظر ڈالئے تو ہر اشاعت کے آدھے سے زیادہ اوراق دوسرے اور تیسرے درجہ کی غزلوں اور نظموں سے گرانبار نظر آئیں گے جس کے برخلاف ساری دنیا کے ہمارے روزآنہ اخباروں میں بھی شعر و شاعری کے چٹخارے ضرور ہوتے ہیں۔ ادب اور شعر کی یہ بدبختی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب ہمارے بہت سے نوجوانوں کے لئے غزلیں یا نظمیں لکھ کر چھپوا دینا ترقی اور تخلیق کا ایک معیار بن گیا ہے حالانکہ جدید شاعری کے اس انبار میں جو کچھ بھی ہو مگر حقیقی ترقی اور تخلیق کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے۔

مشاعروں میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ سننے والوں میں صحیح ادبی ذوق کا پتہ نہیں چلتا اور مشاعروں سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ہمارے مشاعرے سطحی تفریح اور تفنن کا اور بعض اوقات بدمذاقی کے مظاہروں کا ذریعہ بن گئے۔ مشاعروں میں شریک ہونے والوں کی بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے۔ جوان سے صرف وہ لذت نفس حاصل کرنا چاہتی ہے جو سینما یا تھیٹر میں چند گھنٹے گزار کر حاصل ہوتی ہے۔

اس زمانے میں جبکہ اردو زبان سخت مشکلات سے دوچار ہے۔ ان ادبی صحبتوں کا کوئی ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کو اس زبان کی خدمت پر آمادہ کرے جس کی شاعری ان کے لئے فردوس گوش ہوتی ہے۔

شاعری کے قدیم دور میں جب زندگی کا ڈھنگ کچھ اور تھا ان اجتماعات میں کم از کم اتنا تو ہوتا تھا کہ زبان کی اصلاح اور زبان دانی کے معیاروں پر نظر رہتی تھی اور اس طرح زبان کے ذخیرے میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اب تو اس طرف بھی نظر بہت کم جاتی ہے اور یہ اجتماعات اس حیثیت سے بھی بڑی حد تک بے نتیجہ ہو گئے ہیں۔ چند کے علاوہ خود ہمارے شعراء کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ زندگی کی نئی قدروں کو تو اپنا نہ سکے اور اپنی قدیم قدروں سے بھی بیگانہ ہو گئے۔

میری گزارش یہ ہے کہ ہمارے مشاعروں کا ایک معیار ہونا چاہئے۔ بھرتی کے شعرا اور بدمذاق سننے والوں کے لئے ان مشاعروں کے دروازے بند کر دئے جائیں۔ اور ان صحبتوں کو اتنا شائستہ بنایا جائے کہ جب ہم یہاں آکر بیٹھیں تو اپنی زبان کے متعلق فکر اور نظر کو وسیع کر سکیں اور محض رسماً اور تفریح کے طور پر ہر شعر اور ہر مصرعہ کی داد نہ دیں۔ نہ یہ کریں کہ جب شعراء کو ہم پسند نہ کرتے ہوں ان کی تذلیل کے پہلو ڈھونڈیں۔ اہل ذوق کو یہ سمجھ کر کہ یہ ایک علمی صحبت ہے۔ مشاعرے میں آنا چاہئے اور اس سے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کچھ حاصل کرنا چاہئے۔ ہماری اجتماعی زندگی کے دامن پر ایک بڑا دھبہ یہ بھی ہے کہ ان ادبی محفلوں میں اکثر بے ادبی اور بدمذاقی کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ گو کہ مجھ پر کوئی شخص رجعت پسند ہونے کی تہمت نہیں باندھ سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک آداب محفل کا تعلق ہے میں تو چاہتا ہوں کہ قدیم مشاعروں کی کچھ قدیم روایات قائم رہیں اور ہمارے مشاعروں کا مقام ذرا بلند ہو جائے۔

ایک بات مجھے اس زمانے کے نوجوان شعرا سے بھی کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص جو دو متوازن مصرعے لکھ سکتا ہو شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے اختیار وجدان فطرت کا ایک عطیہ ہے اور اس کے بغیر شعر و فن کی گل کاریاں کاغذ کے پھول بن جاتے ہیں جن میں رنگ ہوتا ہے لیکن خوشبو نہیں ہوتی۔ ہمارے نوجوان شعرا کو یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی چاہئے کہ عوام کی خارجی اور داخلی زندگی سے پوری طرح شخصی اتصال پیدا کئے بغیر وہ عوامی شاعر نہیں ہو سکتے اور ان کو عوام تک اپنا پیام پہنچانے کے لئے اپنی زبان کو آسان اور زیادہ قابل فہم بنانا چاہئے۔ اردو زبان کا ایک ہی شاعر ایسا گزرا ہے یعنی نظیر اکبرآبادی جس نے یہ دونوں کام کئے۔ لیکن اس کا زمانہ بھی جاگیرداری کا آخری دور تھا اور اجتماعی زندگی کے وہ مسائل نمایاں نہ ہوئے تھے جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے نظیر کے فکر و نظر کا دائرہ بہت محدود تھا اور وہ اس زمانے کے عوام کی سماجی زندگی کے چند ہی گوشوں تک پہنچ سکا۔

میری آنکھوں نے بارہا یہ تکلیف دہ مناظر دیکھے ہیں کہ جب مشاعرے کی محفلوں میں بدمذاقی کے مظاہرے ہوتے ہیں تو ہمارے شعرا ان کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے خاموشی سے انہیں گوارا کر لیتے ہیں۔ اور یہ نہیں کر سکتے کہ ان مظاہروں کو اپنے فن اور آرٹ کی توہین قرار دے کر محفل سے اٹھ جائیں۔

قاضی صاحب موصوف اچانک دورہ قلب کی وجہ سے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے اس لئے ان کا مطبوعہ خطبہ خیر بہوروی صاحب نائب معتمد انجمن ترقی اردو ہند نے پڑھ کر سنایا۔

ملک میں اردو کو ایک خاص مقام حاصل ہے

وزیر اعظم مسٹر نہرو کی تقریر

۰ دسمبر کو وزیر اعظم مسٹر نہرو نے اردو ہال حیدرآباد کا افتتاح کیا، جس کو حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو نے تعمیر کیا ہے۔ اور فرمایا۔

ملک میں اردو کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اردو ہندستان کے لئے ایک قیمتی ورثہ ہے۔ اردو جس قدر ترقی کرے گی اسی قدر ملک اور دوسری زبانوں کو فائدہ ہوگا۔ اردو ایک ہندستانی زبان ہے اور اس کا وجود سنسکرت سے عمل میں آیا، بعد میں فارسی، عربی اور انگریزی کا اس پر اثر پڑا۔ یہ کہنا کہ اردو ایک غیر ملکی یا مسلمانوں کی زبان ہے کوئی معنی نہیں رکھتا

وزیر اعظم نے اردو بولنے والوں سے کہا کہ وہ اس زبان کے خلاف دشمنانہ نظریہ کو فروغ نہ دیں، کیونکہ اسکے معنی مرتب ایمانی اور تنگ نظری کے ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم نے جو خود بھی اس وقت اردو ہی میں تقریر کر رہے تھے کہا کہ اس وقت ملک کے اندر ریاستی کمیشن کی رپورٹ سے گرما گرم بحثیں جاری ہیں، جن کا تعلق زبانوں ہی سے ہے۔ زبان کا سوال ایک ایسا سوال ہے کہ عوام کی روزمرہ کی زندگی پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ ملک کی تمام زبانوں کو مساوی ترقی اور عوام کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہیں یا نہیں اور یہی ہماری حکومت کی پالیسی ہے۔

ہماری چودہ قومی زبانیں ہیں، جن کی فہرست ہمارے آئین میں شامل ہے۔ ان میں اردو بھی شامل ہے۔ ہندی ان میں شامل نہیں ہے کیونکہ اس کو ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔ بہتر ہوگا اگر انگریزی کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے۔ ہمیں کسی زبان پر روک نہیں لگانی چاہئے عوام کو کسی زبان کے پڑھنے کی آزادی ہونی چاہئے۔

۰ سالہ تنازعہ

گزشتہ ۰ برس سے اردو اور ہندی کے درمیان تنازعہ جاری ہے۔ ساٹھ سال پیشتر میرے اس صوبے میں ہندی کو کوئی درجہ حاصل نہیں تھا۔ اس لئے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہندی کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ لیکن اس تحریک نے اردو اور ہندی کے درمیان مقابلہ کی شکل اختیار کر لی۔ یہ ایک غلطی تھی کہ جس سے اردو اور ہندی کے کاز کو نقصان پہنچا۔

اردو اور ہندی کے گرامر میں بہت تھوڑا فرق ہے، وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ ان میں سے ایک کی ترقی کا دوسری پر خاطر خواہ اثر ہوگا۔ اردو اور ہندی کے درمیان ایک خاص تعلق ہے اور یہ بدقسمتی ہے کہ اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔

اردو ہندی کی دشمن نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی اور اس کی کا ایک ذریعہ ہے۔ ہندی میں اردو کے ۰ فیصدی الفاظ ہیں۔ سب سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ اس کو تمام سمجھتے ہیں۔ مزید برآں اردو تلنگانہ، مرہٹھواڑہ اور کرناٹک کے پرشتی حیدرآباد اسٹیٹ کے لئے ایک غیر ملکی زبان تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں خود کو اب بے گھر پاتی ہے۔ تاہم کوئی وجہ نہیں کہ لوگ جاننا جاری نہ رکھیں۔

حکومت کی پالیسی

حکومت کی پالیسی طے ہو چکی ہے۔ بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دلائی جائے۔ مثال کے طور پر بمبئی کے میونسپل اسکولوں میں ۱۰ زبانیں ذریعہ تعلیم ہیں۔

پنجاب کا ذکر

پنجاب میں ایک اور اختلاف ہوا، وہاں پر لوگ عام طور پر بولتے ہیں، پنجابی اردو اور ہندی میں کوئی زیادہ فرق نہیں، لیکن رسم الخط کے سوال پر جھگڑا ہے اور اس میں مذہبی احساس کو بھی دخل ہے۔ لیکن یہ جھگڑا اردو زبان میں اور اردو اخبارات کے ذریعے جاری ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھگڑا بے وقت ہے۔ زبانوں کو محدود نہیں کرنا چاہئے انھیں پھلنے پھولنے کی آزادی ہونی چاہئے۔ ورنہ ان کی نشوونما نہیں ہو سکے گی۔

انگریزی آزادی کے بعد ہندستانی زبانوں نے خاص ترقی کی ہے لیکن ہمیں انگریزی کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم خود کو نقصان پہنچائیں گے۔ اردو اور ہندی میں جھگڑے کے کوئی معنی نہیں۔ اردو ایک ہندستانی زبان ہے اور دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد میں اس نے نشوونما پائی اور اردو میں دوسری زبانوں کے ساتھ مل کر ترقی کرنے کی صلاحیت ہے۔

حیدرآباد میں اردو کو مصنوعی پوزیشن حاصل ہے، یہ اوپر سے لادی گئی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حیدرآباد میں اردو کا رتبہ کم کر دیا جائے۔ یقیناً افسوس ہوگا اگر اس قسم کی بات ہوئی میں چاہتا ہوں کہ اردو اور دوسری علاقائی زبانیں